© rasailojaraid.com

پروفیسر مشیر الحق
سابق وائس چانسلر، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر

مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست
کل اور آج

ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں مذہب کے رول کا اندازہ کرنے کی غرض سے اس مضمون میں ہندوستانی مسلم قیادت کی ماہیت اور خصوصیات کے مطالعے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں چونکہ اس بات کا علم ضروری ہے کہ اس صدی میں آزادی کی جدوجہد کے دوران مسلمانوں کو کس قسم کی قیادت حاصل تھی، اس لیے یہ مقالہ اگر ایک طرف ماضی قریب اور حال کے واقعات کی تصویر کشی کرتا ہے تو دوسری جانب آیندہ پیش آنے والے حالات کی کسی حد تک نشاندہی بھی کرتا ہے۔

اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ غدر سے قبل برطانیہ کے سیاسی اور سماجی اثرات کو قبول کر لینے والے دوسرے علاقوں کی طرح دہلی اور اس کے اطراف کے مسلمان بھی نئی زندگی سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرنے لگے تھے، دہلی میں انگریزوں کے قائم کردہ دہلی کالج میں مسلمان طالب علم بھی تھے اور استاد بھی۔ بعض لوگوں نے مغربی علوم وفنون اور سائنس کو اُردو میں منتقل کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ بھی نظر آتا ہے کہ علما، جن پر اکثر و بیشتر مسلمانوں اور جدید طرزِ زندگی کے درمیان حدِ فاصل بن جانے کا الزام لگایا جاتا ہے فی الحقیقت شروع میں نہ تو انگریزوں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وحشت کھاتے تھے اور نہ ہی انگریزی چیزوں سے، اس زمانے کے فتوؤں، یادداشتوں، سوانح عمریوں اور سرگزشتوں کا بے لاگ مطالعہ ہر شخص کو یہ باور کرا دے گا کہ علما نے ان محرکات کی شدید مخالفت کرنے کے باوجود جو اُن کی فہم وفراست کے مطابق لامذہبیت کی طرف لے جا سکتے تھے۔ مذہب اور لامذہب کے درمیان حد بندی کی ایک لائن کھینچ رکھی تھی، ان دو باتوں کے مابین توازن اور اعتدال قائم رکھتے ہوئے اُنھوں نے مسلمانوں کو ضرورت پڑ جانے پر انگریزی پڑھنے، مغربی لباس پہننے اور عیسائیوں کے ساتھ سماجی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ لیکن ان اقدامات کا غدر کے ساتھ ہی خاتمہ ہو گیا اور غدر کے بعد حالات نے جو رُخ اختیار کیا اس کے پیشِ نظر مذکورہ بالا خطوط پر پیش رفت کرنے والوں کو مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

حقیقتاً غدر نے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان اتنی بڑی خلیج حائل کر دی تھی کہ لوگ دونوں کو قریب لانے کی بات کا بمشکل ہی اظہار کر سکتے تھے، پھر بھی یہ صورتِ حال زیادہ دنوں تک باقی نہ رہی۔ وقتاً فوقتاً لوگوں نے حالات پر نظر ثانی کرنے اور حاکم فرنگیوں اور محکوم مسلمانوں کے درمیان خوشگوار روابط کو زندہ کرنے کی مخلصانہ کوشش شروع کر دی۔ مثلاً کلکتہ میں ایک خطاب یافتہ مسلمان نواب عبداللطیف نے ''محمڈن لٹریری سوسائٹی'' قائم کی۔ اعلا اور خوشحال متوسط طبقے کے مسلمانوں پر مشتمل اس سوسائٹی کی غرض و غایت بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کے سماجی، سیاسی اور مذہبی مسائل پر غور وفکر کرنا تھا۔ سوسائٹی کے علما نے اپنے اوپر یہ بات لازم کر لی تھی کہ وہ مسلمانوں کے ذہنوں سے اس غلط فہمی کو نکال پھینکیں گے کہ انگریز اُن کے مذہب کو مٹانے کے درپے ہیں، فی الحقیقت یہ ایک انتہائی مشکل کام تھا۔ اس لیے کہ مسلم عوام بالخصوص بنگال اور بہار کے مسلمان فرائضی اور نام نہاد وہابی تحریک کے گہرے اثرات کے تحت مذہبی بنیادوں پر نہ صرف انگریزوں کے دشمن تھے بلکہ ہر وقت ان کے خلاف جہاد کا نعرہ بلند کرتے رہتے تھے چونکہ ''محمڈن لٹریری سوسائٹی'' کو اس رجحان کے خلاف لڑنا تھا، لہٰذا اس کے ممتاز علما نے اپنی تقریروں اور فتوؤں کے ذریعہ برملا کہنا شروع کیا کہ ہندوستان کے حالات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جہاد کے متقاضی نہیں ہیں۔ (۱)

دلی کی صورت حال کلکتہ سے مختلف تھی۔ دہلی نے غدر کے دوران اپنے آپ کو باغیانہ سرگرمیوں کی آماج گاہ ثابت کر دیا تھا۔ یہاں کے مسلم عوام وخواص غدر کے تلخ نتائج کو بھگت رہے تھے اور مسلمان اور انگریز دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ شدید نفرت اور عداوت کا اظہار کر رہے تھے۔ ایسے حالات میں کسی کا پیش رفت کر کے اس جمود وتعطّل کی فضا کا استیصال کرنا ضروری تھا۔ سرسید نے اس چیلنج کو قبول کر لیا۔

سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء) نے زندگی کے ہر میدان میں خواہ وہ سماجی رہا ہو یا سیاسی، معاشی رہا ہو یا مذہبی، مسلم معاشرے کی ازسرِ نو قوت آفرینی کے پروگرام کا آغاز کیا۔ اس وقت ان کے لیے مسلمانوں کو اپنی نیک نیتی کا یقین دلانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس علاقے کے علما کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ عیسائی مبلغین برطانوی حکومت کی مدد سے ان کے مذہب کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اپنے طرزِ زندگی میں تبدیلیوں کے اندیشہ سے علما نے مذہبی تعلیم کا سہارا لیا اور اس مقصد کی خاطر اُنھوں نے حکومت کے مالی اور انتظامی تعاون سے آزاد رہ کر مدرسوں کو قائم کرنا شروع کر دیا۔

ان مدرسوں کے قیام کا اولین مقصد مسلمانوں کے تعلیمی اور تہذیبی ورثہ کو برقرار رکھنا تھا جس کی تباہی و بربادی فرنگی دورِ حکومت میں عین ممکن نظر آ رہی تھی۔ ان مدرسوں کے بارے میں یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ بیسوی صدی کے اوائل تک ان مدرسوں کے فارغین نے مسلمانوں کے روایتی طور وطریق کو برقرار رکھنے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔

سرسید کی نظر مستقبل پر تھی، اُنھوں نے ماضی کے دھندلکوں میں رہنا پسند نہیں کیا، ان کی یہ آرزو تھی کہ مسلمان زندگی کے حقائق کو سمجھیں اور پھر اُنھیں بہ حسن وخوبی اختیار کریں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر اُنھوں نے مختلف جہتوں سے الگ الگ مرحلوں میں اپنی مہم کا آغاز کیا۔ پہلا مرحلہ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کا تھا یہ غدر اور ۱۸۶۹ء میں ان کے سفرِ برطانیہ کا درمیانی عرصہ تھا۔ اس زمانے میں اُنھوں نے ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' نامی کتاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نکالی۔ اس کے علاوہ برطانیہ کے وفادار مسلمانوں کے حالات پر مشتمل کتابچوں کا ایک سلسلہ شائع کرنا شروع کیا تاکہ وہ حکمراں طبقے کو اس بات کی یقین دہانی کرا سکیں کہ غدر جیسے باغیانہ فعل میں مسلمانوں کا ہاتھ یا تو بالکل نہیں یا بہت ہی معمولی تھا۔ دریں اثنا جن جن جگہوں پر انھیں سرکاری ملازم کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا وہاں انھوں نے نئے نئے اسکولوں کی داغ بیل ڈالی۔ ان اسکولوں کے طلبہ اور عام اُردو دانوں کے استفادہ کے پیش نظر انھوں نے مغربی ادب اور سائنس پر مشتمل کتابوں کے ترجمے کے لیے ایک ''ٹرانسلیشن سوسائٹی'' بھی قائم کی۔

دوسرے مرحلہ پر سرسید نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے کی ذمہ داری اٹھائی اور دونوں مذہبوں کے درمیان رشتۂ اتصال کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے بائبل کی ایک تشریح شائع کی۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے مقالات میں عیسائیوں کے ساتھ سماجی تعلقات قائم کرنے پر زور دیا۔ (۱)

اس کے بعد ہی انھوں نے انگلستان کا بحری سفر کیا جہاں کی تہذیب اور جدید تعلیم سے متاثر ہو کر انھوں نے لکھا کہ... ''ہندوستانی باشندے خواہ وہ ادنا ہوں یا اعلا، سرمایہ دار ہوں یا معمولی دکاندار، عالم ہوں یا جاہل، علم و اخلاق اور ایمانداری میں انگریزوں کے بالمقابل یوں نظر آتے ہیں جیسے لائق اور خوبصورت انسانوں کے بالمقابل گندے جانور...'' اپنے خیالات کی تشہیر کے لیے اسی زمانے میں انھوں نے اپنا اردو رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ اس رسالے نے جلد ہی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا اور سرسید کے ارد گرد ایسے باصلاحیت افراد اکٹھا ہونے لگے جو سماجی اور سیاسی مسائل پر انھیں جیسے خیالات رکھنے کے باوجود اس وقت تک ایک طرح سے بے راہبر تھے --- اپنی کامیابیوں سے حوصلہ پا کر سرسید نے اپنے اس خیال کی تبلیغ شروع کر دی کہ مسلمانوں کا ایک ایسا کالج ہونا چاہیے جہاں اسلام کی اخلاقی

(۱) اس طرح کی ہم عیسائی مفاہمت ضروری تھی ... سے مرحوم سید نے کام لیا اسی طرح آج بھی
... ضرورت ہے ... (ادارہ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قدروں کے ساتھ ساتھ جدید علوم اور یورپی زبانیں پڑھائی جاسکیں۔

۲

علما اور سرسیّد ابتدا سے ہی دو مختلف راستوں پر چل رہے تھے۔ علما جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، مذہبی روایات سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ نتیجتاً وہ عہدِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی تعلیمی میراث کو برقرار رکھنے نیز اس کو ترقی دینے کے زیادہ خواہاں تھے۔ ازمنۂ وسطیٰ سے اپنی اس گرویدگی کے سبب اُنھوں نے فطری طور پر ''جدت مخالف'' یا بظاہر ''برطانیہ مخالف'' رویّہ اپنا رکھا تھا۔ دوسری طرف سرسیّد کے نزدیک جدید قدروں بلکہ حقیقتاً برطانوی قدروں کو دل و جان سے اختیار کر لینا ترقی کے لیے ضروری تھا۔ مختصراً ان دونوں گروہوں کے درمیان سب سے بڑا اختلاف جس بات پر تھا اسے آج ہم ''ماڈرنزم'' کہہ سکتے ہیں۔ علماء کی نظروں میں ''ماڈرن'' ہونے کا مطلب تقریباً ارتداد تھا جبکہ علی گڑھ تحریک کے نزدیک وہ اسلام ہی نہیں ہوسکتا تھا جس کی تشریح و تفسیر جدید انداز اور نئے اسلوب میں نہ کی جاسکے۔ مذہبی مسائل پر سرسیّد کی تحریریں اور اُن کے مخالفین کی تنقیدیں ان دونوں رجحانات کی بیّن مثالیں ہیں۔

کسی ملک میں مسلمانوں کی سیاسی قوت کا زوال تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں، تنزل و انحطاط کی ایسی مثالیں بے شمار ہیں، لیکن ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت کے اختتام کی بنیادی اہمیت اس حقیقت میں پوشیدہ ہے اور اسلامی تاریخ میں اس کی شاید کوئی نظیر بھی نہ مل سکے گی کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان اپنے سابقہ محکومین کو نہ صرف اپنے مساوی بلکہ مدِ مقابل کی حیثیت سے تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد مواقعِ روزگار کے جو بھی محدود امکانات تھے ان میں انھیں اپنی بقا کے لیے ہندوؤں کے دوش بدوش جدوجہد کرنا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہاں کوئی امیر المومنین نہیں رہ گیا تھا جو مسلمانوں کے سیاسی مفادات کی نگہداشت کرتا نہ ہی ایسا کوئی ادارہ بچا تھا جو اسلام کو اندرونی شکست و ریخت اور بیرونی حملوں سے محفوظ رکھتا۔ اب تک ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں اسلام پر ایسا وقت نہیں آیا تھا جب اسے اپنی حیثیت کا دفاع کرنا پڑا ہو، لوگوں کو سیرت کی آزادی حاصل تھی کہ یا تو وہ اس کی قطعیت کو تسلیم کرلیں یا پھر اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے بے تعلق رہیں لیکن کسی کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی کہ وہ علی الاعلان کہتا پھرے کہ وہ اسلام کو رسمی طور پر قبول کیے بغیر بہتر زندگی گزار رہا ہے یا گزار سکتا ہے۔ انیسویں صدی میں اور خاص طور سے ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی مرتبہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی مناظروں کی ایک ہوا چل پڑی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مناظروں کا بنیادی مقصد ایک دوسرے کو سمجھنے سے زیادہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانا تھا۔

دونوں گروہوں کے مذہبی لیڈروں نے عوامی سطح پر جب مذہبی تنازعات کو حل کرنے کی کوشش کی تو اس چیز نے پہلے ہی سے بگڑتے روابط کو اور بھی خراب کر دیا۔ یہ مناظرے مسلمانوں کے ذہنوں میں دو طرح کے خیالات پیدا کر رہے تھے۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے محسوس کیا کہ ہندو اُن پر سیاسی اور معاشی غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، دوسرے یہ کہ ہندوؤں کی ان کوششوں کے پسِ پردہ انگریزوں کا ہاتھ ہے۔ اس طرح وہ ہندوؤں اور انگریزوں دونوں سے بدگمان ہو گئے۔

۳

علی گڑھ سیکولر مکتبِ فکر کو ہندو مذہب پر اسلام کی برتری ثابت کرنے سے کہیں زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ سر سیّد کی زیرِ قیادت یہ گروپ ''طبقۂ شرفا'' سے تعلق رکھنے والے ان مسلمانوں پر مشتمل تھا جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں مسلم دورِ حکومت کے باقاعدہ خاتمہ سے بہت پہلے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اس ڈرامے کا اختتام قریب آ پہنچا ہے جس میں مغلیہ حکومت ایک نمایاں رول ادا کر رہی تھی۔ مثلاً سر سیّد احمد خاں (۱۸۱۷ء-۱۸۹۸ء)، نذیر احمد (۱۸۳۱ء-۱۹۱۲ء)، ذکاء اللہ (۱۸۳۲ء-۱۹۱۴ء)، محسن الملک (۱۸۳۷ء-۱۹۰۷ء)، الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) اور علی گڑھ برادری سے تعلق رکھنے والے دیگر سر برآوردہ حضرات نے غدر سے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا کہ جلد یا بدیر برطانوی حکومت مغلوں کی جگہ لینے والی ہے۔ غدر کے دوران ان لوگوں کی عمریں کچھ زیادہ نہیں تھیں اور یہ سب ... ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں کسی نہ کسی طرح مشغول تھے۔ مثلاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرسید احمد خاں منصف تھے --- محسن الملک شعبۂ مالیات میں کلرک تھے، حالی لاہور میں انگریزوں کے قائم کردہ حکومت پنجاب کے بُک ڈپو میں مترجم تھے، اور نذیر احمد ڈپٹی انسپکٹر آف مدارس تھے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ مذکورہ شخصیتوں میں شاید ہی کسی کو جدید تعلیم حاصل کرنے کا بھرپور موقع ملا ہو۔ تقریباً سبھی کی تعلیم و تربیت عہدِ وسطیٰ کے تعلیمی نظام میں مکمل ہوئی تھی۔ مغربی خیالات سے ان کی واقفیت ثانوی ذرائع کی رہین منت تھی --- یا تو مغربی کتابوں کے اردو ترجموں کے ذریعہ یا پھر اپنے انگریز دوستوں کے ذریعہ جو برطانوی دفاتر میں ملازم تھے۔ لیکن یہی لوگ مسلمانوں میں مغربی قدروں کے واحد ترجمان تھے۔ نتیجتاً ان لوگوں نے جب اپنے قدیم سرمایے کی چھان بین شروع کی تو اعتدال و توازن کی روش قائم نہ رکھ سکے۔ مثلاً ڈپٹی نذیر احمد، جن کا شمار اساطینِ اردو میں کیا جاتا ہے، اپنے ادبی سرمایے سے نہ صرف یہ کہ غیر مطمئن تھے بلکہ مغربی ادب کے مقابلہ میں اسے گھٹیا سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں ان کا ادب ''غلط بیانی اور خوشامد'' کا پٹارا تھا۔ اگرچہ وہ بقول خود بڑھاپے میں میاں مٹھو کی طرح انگریزی کے چند الفاظ بولنے لگے تھے لیکن حقیقتاً مشرقی ادب کے مطالعہ نے ان کی ذہنی بالیدگی کو جو نقصان پہنچایا تھا اس کا مداوا نہیں ہوسکتا تھا۔ (۲) اسی طرح حالی کی آنکھیں بھی انگریزی ادب کی چمک دمک سے خیرہ ہو چکی تھیں، اور خود اُن کے کہنے کے مطابق انگریزی ادب کی محبت نے آہستہ آہستہ ان کے دل سے مشرقی خصوصاً فارسی ادب کی محبت کو نکال پھینکا تھا۔ (۳)

بہرحال مشرق و مغرب کے پُر پیچ مسائل کا ناقص علم رکھنے کے باوجود علی گڑھ مکتبِ فکر نے ہی خلا کو کسی حد تک پُر کیا اور مسلم طبقے کا ترجمان بن گیا۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی خاطر اس گروپ کو حکمران طبقے پر مکمل بھروسا کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ مسلمان حکومت کے دستِ راست بن جائیں اور زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر ملازمتیں حاصل کریں۔ اُردو کے مشہور طنز نگار شاعر اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶ء-۱۹۲۱ء) نے جنھیں ان کے ہم عصروں نے ''لسان العصر'' کا خطاب دیا تھا، اس صورتِ حال کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تصویر کشی اپنے خاص انداز میں کی ہے:

انگریز خوش ہے مالک ایروپلین ہے
ہندو مگن ہے اس کا بڑا لین دین ہے
بس اک ہمیں ہیں ڈھول کا پول اور خدا کا نام
بسکٹ کا صرف چور ہے، لیمنڈ کا پھین ہے

بسکٹ کا چور اور لیمنڈ کا پھین بھی صرف اسی وقت تک مل سکتا تھا جب تک حکومت خوش رہتی۔ اس لیے کسی حالت میں بھی یہ لوگ برطانوی حکومت کو ناراض کرنے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ آج ہمیں سننے میں یہ بات بھلے ہی اچھی نہ معلوم ہو کہ علی گڑھ کی قیادت نے برطانیہ کے ساتھ تعلقات و روابط قائم کرنے میں کچھ زیادہ ہی فراخ دلی کا ثبوت دیا لیکن اگر ہم اس وقت کے عام حالات کے پس منظر میں امر واقعہ کا تجزیہ کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ان کے موقف میں بہت حد تک معقولیت تھی۔ یہ حقیقت تقریباً تسلیم شدہ ہے کہ غدر میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مساوی حصہ لیا تھا لیکن بغاوت کو کچلنے کے بعد انگریزوں نے خاص طور سے مسلمانوں کو اس تحریک کے بھڑکانے کا ذمہ دار قرار دیا اور انھیں اپنے انتقام کا مخصوص نشانہ بنایا۔ صرف افراد کو سزائیں نہیں دی گئیں بلکہ مسلمانوں پر بہ حیثیت مجموعی سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ انگریزوں کے اس امتیازی روّیے کو ہندوؤں نے بالعموم سراہا لیکن جب مختلف اسباب کے پیشِ نظر حکومت نے اپنی اس پالیسی پر نظر ثانی کی اور مسلمانوں کے ساتھ مصالحانہ حکمتِ عملی اختیار کی تو ہندوؤں کے ایک طبقہ نے اس بات کو پسند نہیں کیا اور ان کے اخبارات نے ''ناقابلِ تسخیر کو مسخر کرنے کی غیر عاقلانہ کوششوں پر لمبے چوڑے مضامین شائع کیے۔''(۴) مثلاً ۱۸۷۰ء میں کلکتہ سے نکلنے والے ایک اخبار ''ہندو پیٹریاٹ'' (Hindu Patriot) نے حکومت سے اس بات کی اپیل کی کہ وہ مسلم نواز پالیسی سے باز آجائے، کیونکہ تمام مسلمان غدار اور انگریزوں کے دشمن ہیں۔(۵)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴

اس جائزے سے بہرحال ایک بنیادی اور واضح نکتہ یہ سامنے آتا ہے کہ اس وقت تک نہ تو علی گڑھ اسکول کی سیکولر قیادت کو اور نہ ہی علما کی مذہبی سیادت کو کل ہند پیمانے پر سربراہی کا درجہ حاصل تھا۔ غیر ملکی حکمرانوں کے بارے میں جہاں تک علما کا رویہ تھا تو ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ بنگال میں اُن کا ایک گروپ کھل کر مسلمانوں کو انگریزوں سے قریب لانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ علی گڑھ کی ''آل انڈیا'' حیثیت اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب ہم ہندوستان کے جنوبی اور مغربی حصوں کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال پر نظر ڈالتے ہیں۔

جنوبی اور مغربی ہندوستان کے مسلم طبقوں کی معاشی اور سماجی بنیادیں شمالی ہند کے مسلمانوں کی سماجی اور معاشی بنیادوں سے قطعی طور پر مختلف تھیں۔ شمال، مسلم حکومت کا گڑھ رہ چکا تھا، لہٰذا یہاں جاگیردارانہ نظام کو فروغ حاصل تھا۔ اس کے برخلاف ملک کے جنوبی اور مغربی حصے کے لوگ اپنی بقا کے لیے حکمراں طبقے پر انحصار نہیں کرتے تھے۔ اس چیز نے ہندوستان کے دونوں حصوں کے مسلمانوں کے نقطۂ نظر میں خاصا فرق پیدا کر دیا تھا۔ چونکہ بمبئی اور مدراس کے مسلمانوں کو اپنی روٹی روزی کے لیے حاکموں پر بہت زیادہ بھروسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے مغلیہ سلطنت کے زوال کا بھی ان پر بہت کم اثر پڑا۔ یہاں کا سربرآوردہ طبقہ پیشہ ورانہ اور تاجرانہ حلقے سے تعلق رکھتا تھا۔ مزید برآں تعلیمی لحاظ سے بھی یہ لوگ شمال کے مسلمانوں کے بالمقابل زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ اس لیے فطری طور پر شمالی ہند کے مسلمان اور جنوب مشرق سمیت مغرب کے مسلمان معاش پر مبنی سیاسی مسائل کو ایک ہی عینک سے نہیں دیکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شمالی ہند کے مسلمانوں کے برخلاف جنوب مشرقی اور مغرب کے ممتاز مسلمان کانگریس میں شمولیت کو نقصان دہ نہیں تصور کرتے تھے۔ غالباً اسی لیے کانگریس کے تیسرے سالانہ جلسے میں اپنے صدارتی خطبے کو پیش کرتے ہوئے بدرالدین طیب جی نے اس بات پر حیرت ظاہر کی تھی کہ ''شمال کے مسلمان اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ مشترکہ فائدے کی خاطر شانہ بشانہ چلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے حالانکہ بمبئی پریذیڈنسی میں ہم نے اسی اصول پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عمل کیا ہے۔"(۶)

یہ ایک قابلِ لحاظ حقیقت ہے کہ گاندھی جی کی کانگریس میں شمولیت سے قبل ۱۸۸۵ء سے ۱۹۲۰ء تک تین مسلمان کانگریس کی صدارت کے عہدہ تک پہنچ چکے تھے، لیکن ان میں سے کسی کا بھی تعلق شمال سے نہ تھا۔ پہلے صدر تو بمبئی کے بدر الدین طیّب جی تھے (تیسری کانگریس، مدراس ۱۸۸۷ء)، دوسرے صدر رحمت اللہ محمد سیانی تھے (۷ ویں کانگریس، کلکتہ ۱۸۹۱ء)، ان کا تعلق بھی بمبئی سے تھا۔ تیسرے صدر مدراس کے رہنے والے سیّد محمد تھے (۲۸ ویں کانگریس، کراچی ۱۹۱۳ء) سیّد محمد کے سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ کانگریس کی تاریخ میں وہ واحد مسلمان تھے، جنھیں تین تین امتیازات حاصل تھے، یعنی وہ ۱۹۰۳ء میں استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین، ۱۹۱۳ء میں پارٹی کے صدر اور ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۷ء تک اس کے سکریٹری رہ چکے تھے۔(۷)

اس حقیقت کے باوجود کہ جنوب مشرق اور مغرب کے مسلمان اصولی طور پر ہندوؤں کے ساتھ مل کر سیاسی جدوجہد کرنے کو ضروری سمجھتے تھے۔ وہاں کے مسلمان لیڈروں پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ اُنھوں نے ہندو دوستی کی خاطر مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں، اس کے برعکس وہ مسلم مسائل میں کھلم کھلا دلچسپی دکھاتے تھے، مثلاً بدر الدین طیّب جی نے اپنے آپ کو مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اُنھوں نے بمبئی میں "انجمنِ اسلام" قائم کی جس کی زیرِ نگرانی چلنے والے اسکولوں، اقامت گاہوں، ورزش گاہوں اور کلبوں کے ذریعہ نہ صرف اُنھوں نے مسلم طبقے میں جدید تعلیم کو مقبول بنایا بلکہ اور بہت سی دوسری سماجی اور معاشرتی اصلاحات کا آغاز بھی کیا۔ وہ تعلیمِ نسواں کے بہت بڑے حامی تھے۔ علاوہ ازیں بمبئی میں "اسلام کلب" اور "اسلام جمنازیم" (اب جمخانہ) جیسے جدید ثقافتی مراکز کے قیام کی ذمہ داری بھی طیّب جی کے سر جاتی ہے۔ اسی طرح جنوب میں سیّد محمد اتنے زیادہ باعزت اور باحیثیت تھے کہ جب ۱۹۰۶ء میں شمالی ہند کے مسلمان قائدین لارڈ منٹو کے پاس وفد لے کر جانے لگے تو وہ ان کو نظر انداز نہ کر سکے۔ منتظمینِ وفد نے ان سے اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وفد میں شمولیت کی درخواست کی، لیکن اُنھوں نے شرکت کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ وفد اُن کے اس مشورے کو ماننے پر تیار نہ تھا کہ عرضداشت سے علاحدہ فرقہ وارانہ نمایندگی کے سوال کو ختم کر دیا جائے۔ (۸)

۵

اب غالبًا یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ اُنیسویں صدی کے اواخر تک جیسا کہ ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے، مسلمانوں کی اپنی کوئی مخصوص سیاسی تنظیم نہیں تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہندوستانی مسلمان بہ حیثیتِ مجموعی سیاست سے بیگانہ تھے کیونکہ اس وقت بھی کچھ مسلمان انڈین نیشنل کانگریس میں تھے اور کچھ سرسیّد کے سیاسی فلسفے کی اتباع کر رہے تھے۔ بہرحال مسلمانوں کی اپنی کوئی باقاعدہ پارٹی نہیں تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں بعض مسلمان لیڈروں نے جن کا سیاسی رجحان سرسیّد سے مختلف نہ تھا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کی ایک سیاسی پارٹی --- آل انڈیا مسلم لیگ --- بنائی۔

مسلم لیگ کے قیام کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے دو پارٹیاں تھیں جن میں سے کسی ایک کا انتخاب انھیں کرنا تھا۔ پہلی پارٹی تو انڈین نیشنل کانگریس تھی۔ جو مذہبی تفریق سے بلند ہو کر تمام ہندوستانیوں کی نمائندگی کی دعویدار تھی۔ دوسری پارٹی خود آل انڈیا مسلم لیگ تھی جو اس عزم و ارادہ کے ساتھ میدانِ سیاست میں اتری تھی کہ وہ مسلمانوں کے مخصوص مفادات کی نگہداشت کرے گی۔ اس وقت تک دونوں جماعتوں کی قیادت بلاشرکتِ غیرے مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کے ہاتھوں میں تھی۔ علماء بہ حیثیتِ مجموعی سیاست سے کنارہ کش تھے۔ ان حالات میں کلکتہ کے افق پر ایک نوجوان اُبھرتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے علما کو میدانِ سیاست میں گھسیٹ لاتا ہے۔

یہ مولانا ابوالکلام آزاد تھے جن کے بارے میں دیوبند کے مشہور عالم شیخ الہند مولانا محمود حسن نے فرمایا تھا کہ ہم (علما) سو رہے تھے، ابوالکلام نے ہم لوگوں کو نیند سے بیدار کیا۔

ہندوستانی سیاست کے اسٹیج پر علما کے اس اچانک ظہور نے ملک کی مسلم سیاست میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک نیا زاویہ پیدا کر دیا۔ اب تک مذہب اور سیاست دونوں اپنا الگ الگ میدانِ عمل رکھتے تھے۔ لیکن علما کی آمد کے بعد سیاست کو مذہب کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ گزشتہ صدی کے اختتام پر سرسیّد نے مسلمانوں سے درخواست کی تھی کہ وہ عملی سیاست سے احتراز کریں لیکن یہ درخواست مذہبی بنیادوں پر نہ تھی۔ ان کی واحد دلیل یہ تھی کہ مسلمان چونکہ تعلیمی میدان میں پیچھے ہیں، اس لیے وہ برطانوی حکومت کی مدد کے بغیر سرکاری ملازمتوں میں اپنا مکمل حصہ نہیں پا سکیں گے۔ ان کی اس دلیل میں، اس بات سے قطع نظر کہ صحیح ہے یا غلط، مذہب کا کوئی رول نہیں تھا۔ اُنھوں نے کبھی نہیں کہا کہ سیاست میں حصہ لینا مذہبی لحاظ سے ممنوع ہے۔

دوسری طرف جب مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کو ہندوستانی سیاست کی بازی گاہ میں اُترنے کے لیے اُکسایا تو اپنے سیاسی خیالات کی پوری عمارت اُنھوں نے مذہبی بنیادوں پر استوار کی۔ سیاست کا جھنڈا اُٹھانے والے علما نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو خوب خوب بھڑکایا۔ اُنھوں نے مسلمانوں کو یہ بات باور کرانے کی کوشش کی کہ مذہبی آزادی، سیاسی آزادی سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری ہے۔

اس چیز کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ سیاسی اُمور میں مسلمانوں کی رہنمائی مذہب کے نام پر اس انداز سے کی گئی کہ جس بات کے متعلق بھی اُنھیں بتا دیا جاتا تھا کہ یہ شریعت کے خلاف ہے تو اس کے خلاف کوئی قدم اُٹھانے کی وہ جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

یہ رجحان برابر قائم رہا۔ جدوجہدِ آزادی کے دوران پہلی صف میں براجمان علماء کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مذہبی حوالوں کے بغیر بات نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر مسئلہ کا تصفیہ مذہبی بنیادوں پر کرتے تھے۔ علما کے خیال کے مطابق اس وقت کے مسلمانوں سے یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ مذہبی فرض کے طور پر خلافت تحریک کے مقاصد کی تائید اور اس سے تعاون کریں گے۔ بیرونی سامان کا بائیکاٹ ان پر اس لیے لازم تھا کہ ان کے مذہب کا یہی فیصلہ تھا۔ ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا بھی ان پر اس لیے ضروری تھا کہ خدا نے انھیں اس کا حکم دیا تھا۔ (۹)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک مرتبہ جب مسلمانوں کی تربیت اس انداز سے کر دی گئی کہ وہ سیاست کو مذہب کی عینک سے دیکھا کریں تو اُن سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ مذہبی دلائل کے علاوہ وہ کسی اور بات پر دھیان دھریں گے۔ جب تک علماء بہ حیثیتِ مجموعی قوم پرست رہے اس وقت تک مسلم عوام کو اپنے ساتھ لے کر قومی سیاست کی ڈگر پر چلتے رہنا ان کے لیے آسان تھا۔ لیکن جب ۱۹۴۰ء میں قرار دادِ پاکستان منظور ہو جانے کے بعد مسلم لیگ نے بعض اہم علما پر دسترس حاصل کر لی تو یہ صورتِ حال جاتی رہی۔ لیگی علما ''جمعیۃ العلماءِ اسلام'' کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور نیشنلسٹ علما کے ہر اقدام کی مذہبی بنیادوں پر مخالفت کرنے لگے۔ مسلم اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں کے اس فیصلے کو ہر شخص غیر منطقی کہے گا جس کے تحت انھوں نے مطالبۂ پاکستان کی حمایت کی تھی لیکن گزشتہ صفحات میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی روشنی میں اس پر حیرت و استعجاب کی گنجایش باقی نہیں رہ جاتی۔ سب سے پہلے نیشنلسٹ علما نے قرآن و حدیث کی بنیاد پر اپنے سیاسی موقف کو ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ وقت آنے پر لیگی علما نے مطالبۂ پاکستان کی تائید میں انھیں مآخذ و حوالہ جات کا سہارا لیا اور اپنے فعل کو اسلامی عمل قرار دینے کی پوری کوشش کی۔ اس موقف کے علاوہ ہر اقدام ان کے نزدیک غیر اسلامی تھا۔ پاکستان روے زمین پر حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کی جانب پہلا قدم تھا۔ اس لیے اس بات پر زور دیا گیا کہ الکشن میں اگر مسلم لیگ کو شکست ہوئی تو ایک صالح اور صحت مند اصول ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے گا۔ (۱۰)

ہندوستانی مسلمانوں سے قوم پرست علما مذہب کی راہ میں قربانی کا مستقل طور پر مطالبہ کر رہے تھے۔ مثلاً ۱۹۲۰ء میں ہزاروں مسلمان اپنی مساجد و مقابر کو غیر مسلموں کے حوالے کر کے علما کی اس یقین دہانی پر ملک سے ہجرت کر گئے تھے کہ ایسا کرنا ان کی مذہبی ذمہ داری تھی۔ تحریکِ عدم موالات کے دوران مسلم وکلا اور تجار نے اپنا پیشہ ترک کر کے بیرونی سامان کا بائیکاٹ کر کے غربت و افلاس کو صرف اس وجہ سے گلے لگایا تھا کہ ان کے سامنے ترکِ موالات کی منطق کو مذہبی پلیٹ فارم سے پیش کیا گیا تھا۔ اگر اس وقت کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو مسلمانوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو اُن کی مذہبی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے روک سکتی تو تقسیم کے وقت کس طرح اُمید کی جا سکتی تھی کہ اقلیتی صوبے کے مسلمان اپنی قربانی دینے سے باز رہ جائیں گے۔ یہ بہر حال مذہبی سیاست کی ایک شاندار فتح تھی--- ملک تقسیم ہوگیا اور ہندوستان میں بود و باش کو ترجیح دینے والے مسلمانوں کے سامنے نئے نئے مسائل آ کھڑے ہوئے۔

۶

جمہوریۂ ہند میں مسلمانوں کو ایک لازمی مگر غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ انڈیا مسلم لیگ جو اب تک مسلم مفادات کی واحد ترجمان ہونے پر مصر تھی، میدان سے یکا یک غائب ہوگئی۔ نام نہاد سیکولر ذہن رکھنے والے مسلم رہنما یا تو مسلمانوں کو اپنی حکومت کا وفادار رہنے کی تلقین کر کے پاکستان پرواز کر گئے یا پھر اپنے گزشتہ اعمال کی تلافی اس بات کے اظہار کے ذریعہ کرنے لگے کہ وہ وفاداروں سے بڑھ کر وفادار اور مخلص ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ تقسیم ملک کے ساتھ ہی خونریزی، قتل و غارت گری اور بڑے پیمانے پر ہجرت کا سلسلہ چل نکلا۔ اس طرح مسلم سیاست کچھ عرصہ کے لیے معطل ہو کر رہ گئی۔ ۱۹۴۸ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں لائحہ عمل طے کرنے کے لیے بچے کھچے مسلم قائدین کا ایک کنونشن لکھنؤ میں منعقد کیا۔ اس کنونشن میں یہ طے کیا گیا کہ مسلمان اب علاحدہ مسلم سیاسی جماعتیں نہیں بنائیں گے۔ درحقیقت یہ فیصلہ ان کی اس دیرینہ روش سے انحراف کے مترادف تھا جس کے مطابق ان کی سیاسی تربیت ہوئی تھی۔ لیکن حالات کا دباؤ اتنا شدید تھا کہ علما بھی جن کے نزدیک سیاست اور مذہب کا چولی دامن کا ساتھ تھا، سیاست کو مذہب کی حدود سے باہر رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ حتیٰ کہ جمعیۃ العلماء ہند نے بھی جو اس وقت تک مذہب پسند قوم پرور مسلمانوں کا سیاسی پلیٹ فارم تھی، مستقبل میں صرف مذہبی اور سیاسی مقاصد کے لیے جدوجہد کرنے کا اعلان کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ جمعیۃ نے غیر رسمی طور پر انڈین نیشنل کانگریس کی ردیف بنے رہنے کے باوجود اپنے ممبروں کو یہ آزادی دے دی کہ وہ انفرادی طور پر اپنی پسند کی سیاسی جماعتوں کے بھی ممبر بن سکتے ہیں۔ اس غیر معمولی تبدیلی کی ایک وجہ شاید یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی کہ جمعیۃ کو اعتماد تھا کہ حکومت اور کانگریس پارٹی میں مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کی موجودگی کی وجہ سے نئے ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ سوتیلے پن کا برتاؤ نہیں کیا جائے گا۔ شاید اسی اعتماد کی وجہ سے یہ بھی ضروری نہیں سمجھا گیا کہ خود کانگریس میں کوئی ایسی لابی یا پریشر گروپ بنایا جائے جو بوقت ضرورت مسلمانوں کے مسائل کو حل کرانے میں مؤثر رول ادا کر سکے--- بہرحال حالات اور رویہ کی تبدیلی کے باعث یہ عین ممکن تھا کہ مسلمان غیر مذہبی سیاست کو اپنا لیتے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم قیادت کے علاوہ خود اس وقت کی ہندوستانی سیکولر قیادت کے ذہن میں بھی سیکولر اور سیکولرزم کا مطلب واضح نہیں تھا۔ برسہا برس تک تو اس بات پر بحث ہوتی رہی کہ ہندوستان کے تناظر میں سیکولر اور سیکولرزم کا مفہوم کیا ہے۔ جتنے منہ تھے، اتنی باتیں تھیں۔ اس طرح خود "سیکولر ریاست" ایک بے معنی لفظ بن کر رہ گئی۔ لیکن اس دوران مسلم مخالف قوتیں اپنے کام میں برابر مشغول رہیں اور مسلمانوں نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ اگر وہ اپنے مذہبی اور ثقافتی امتیازات کو باقی دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر انھیں خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرنی چاہیے--- علاوہ ازیں فرقہ وارانہ فسادات اور مسلم طبقہ کے ساتھ انتظامیہ کے سوتیلے پن نے ان لوگوں کے لیے راہیں پھر سے ہموار کر دیں جو اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کی خاطر آواز بلند کرنے کو اپنی مذہبی ذمہ داری خیال کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ علما نے بھی یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ آزادیِ وطن کے لیے، اپنی قربانیوں کے باوجود، مسلمانوں کو اپنے ہی ملک میں مذہبی انداز سے زندگی گزارنے کے حق سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ اس طرح وہ علی الاعلان سیّد ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) کی زبان میں یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ برطانوی راج سے نجات پانے کے لیے مسلمانوں کا جوش وخروش مدھم پڑ جاتا، اگر انھیں پہلے سے یہ معلوم ہو جاتا کہ آزادی کے بعد اسلامی عقیدے کے مطابق زندگی گزارنے کی ان کی فطری اور آئینی خواہش کو پروان چڑھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ (۱۱)

رفتہ رفتہ حالات نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ "فیصلۂ لکھنؤ" پر نظر ثانی کریں اور مستقبل کے لیے [illegible] مختلف سیاسی اور غیر سیاسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رجحانات رکھنے والے مسلم قائدین اس وقت کے علیل اور آزردہ دل قدیم کانگریسی رہنما ڈاکٹر سید محمود کی دعوت پر جمع ہوئے۔ باہم غور وفکر کے بعد یہ طے کیا گیا کہ مسلمانوں کے مسائل کو حل کرانے کے لیے چوں کہ کانگریس پر مزید بھروسا نہیں کیا جا سکتا، اس لیے ان غیر کانگریسی سیاسی جماعتوں اور قائدین سے رابطہ قائم کیا جائے جو مسلمانوں کی مدد کرنے کا وعدہ کریں۔ اس طرح ۱۹۶۳ء میں مسلم مجلسِ مشاورت کا قیام عمل میں آیا، جس میں جماعتِ اسلامی نے بھی، جو اَب تک عملی سیاست سے کنارہ کش رہا کرتی تھی، حصّہ لیا۔ اگرچہ اپنے منشور کے مطابق مشاورت کوئی سیاسی پارٹی نہیں تھی لیکن سیاست سے بہر حال اس کا گہرا تعلق تھا۔ اس نے حقِ رائے دہندگی کے سلسلے میں مسلمانوں کو ایک منفی طریقِ کار اپناتے ہوئے مثبت رہنمائی بہم پہنچانے کا اہتمام کیا۔ اس سے قبل مسلمان بہ حیثیتِ جماعت بالعموم اپنے ووٹ کانگریس کے حق میں ڈالتے تھے۔ لیکن ۱۹۶۷ء کے الیکشن میں مشاورت نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے ووٹ کانگریسی اُمیدواروں کے بجائے ان غیر کانگریسی اُمیدواروں کے حق میں ڈالیں جو اُن کے مقاصد کے سلسلے میں ریاستی اسمبلیوں اور پارلی منٹ میں ان کی مدد کرنے کا وعدہ کریں۔ یہ ایک بالکل ہی نیا تجربہ تھا۔ مشاورت کے تعاون سے اچھے خاصے غیر کانگریسی اُمیدوار کامیاب ہوئے۔ لیکن وقت پڑنے پر اُن لوگوں نے جن پر مشاورت اپنا حق سمجھتی تھی عملاً یہ جتا دیا کہ وہ اپنی ذات یا اپنی پارٹی کے سوا کسی دوسرے کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں۔

حالات ایسے حوصلہ شکن ثابت ہوئے کہ مشاورت کے ایک گروپ نے مسلم مفاد کی نگہداشت کی خاطر ایک علاحدہ باقاعدہ سیاسی تنظیم قائم کرنے کی بابت سوچنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم کی قیادت میں مشاورت کے وہ تمام لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے۔ جو مشاورت کے جامد اور انفعالی طریقِ کار سے مطمئن نہیں تھے، اس طرح ڈاکٹر فریدی کی قیادت میں اُتر پردیش میں مسلم مجلس کی بنیاد پڑی، اور ۱۹۶۹ء میں جب اُتر پردیش میں ریاستی اسمبلی کے لیے الکشن ہوا تو مسلم مجلس نے باقاعدہ اپنے اُمیدوار کھڑے کیے۔ الکشن کے نتائج غیر معمولی طور پر مجلس کے حق میں رہے اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ جلد ہی مسلم مجلس ایک ایسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سیاسی قوت بن جائے گی جسے نظر انداز کرنا آسان نہ ہوگا۔ لیکن مجلس ایک شعلۂ مستعجل کی طرح چمکی بھی اور بجھی بھی۔ اگرچہ نام کے لیے اس کا وجود آج بھی باقی ہے، لیکن اپنے اثرات کے اعتبار سے وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

بہرحال اگر اور کچھ نہیں تو مسلم مجلس مشاورت اور مسلم مجلس کے تجربوں سے مسلمانوں کی ہمت بندھی اور وہ کھل کر اپنی سیاسی جماعت یا جماعتوں کے قیام کی بات کرنے لگے۔ وقتاً وقتاً کئی ایک جماعتیں بھی ہوئیں۔ مثلاً بہار میں عوامی تنظیم، یا دہلی میں مسلم لیگ اور آدم سینا، لیکن یہ ایسی ہی تھیں کہ بہتوں کو نہ تو ان کے آنے کی خبر ملی اور نہ جانے کا پتا چلا۔ ہاں انڈین یونین مسلم لیگ نے جو آزادی کے بعد ایک طرح سے کیرالا اور مدراس میں محصور ہو کر رہ گئی تھی، اپنے حصار سے باہر قدم نکالا۔ اس نے شمالی ہند، خصوصاً یوپی کے ان اضلاع میں جہاں مسلمانوں کی معتد بہ آبادی ہے، اپنے اثرات کو پھیلانے کی طرف توجہ کی، لیکن اس سلسلے میں ابھی تک اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

حیدرآباد میں تقسیم سے قبل قائم ہونے والی مجلس اتحاد المسلمین کو آزادی کے بعد ایک ایسے سیاسی اچھوت کی حیثیت دے دی گئی تھی جس کی قربت سے بھی لوگ گھبراتے تھے، اور آہستہ آہستہ اس کا نام بھی ذہنوں سے نکلتا جا رہا تھا۔ لیکن حالات نے پلٹا کھایا اور اس کے موجودہ صدر سلطان صلاح الدین اویسی نے اس میں پھر سے جان ڈالنے کی کوشش کی۔ اگرچہ مجلس اتحاد المسلمین ابھی تک ایک ریاستی جماعت کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن اپنے حلقۂ اثر میں وہ اپنے وجود کو منواتی جا رہی ہے۔ حیدرآباد اور سکندرآباد کے سابقہ میونسپل الکشن میں مجلس نے جو غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے، اسے دیکھتے ہوئے اس علاقہ کے ''فضلائے سیاست'' کے لیے اب یہ بات آسان نہیں رہ گئی ہے کہ وہ اس کے اثرات اور طاقت کو نظر انداز کرتے رہیں۔

جمعیۃ العلماء بھی، جس نے اپنے کو لکھنؤ کنونشن کے بعد ایک غیر سیاسی جماعت میں تبدیل کر لیا تھا، آہستہ آہستہ مجبور ہو گئی کہ اپنے پرانے محور پر لوٹ آئے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دوسری ہندوستانی سیاسی جماعتوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس جماعت کے بھی دو حصے ہو گئے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصل جمعیۃ العلما کی قیادت پرانے کانگریسی مولانا اسعد مدنی کے ہاتھوں میں رہی اور دوسرے گروہ نے ملّی جمعیۃ العلما بنائی جس کی سربراہی مولانا سیّد احمد ہاشمی نے اپنے سر لی جو مسلمانوں کے معاملے میں کانگریس کی پالیسیوں سے برگشتہ ہوکر کچھ دنوں کے لیے لوک دل (بی) میں چلے گئے تھے، لیکن اب پھر کانگریس میں واپس آ چکے ہیں۔

بہر حال ان باتوں کا نتیجہ اور کچھ نکلا ہو یا نہ ہو، اتنا تو ہم نے ضرور دیکھا کہ تقسیم کے فوراً بعد ہندوستانی رہنماؤں نے جس سیکولر قیادت کا خواب دیکھا تھا وہ پورا نہ ہو سکا۔ (☆) اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ لوگوں کی نظریں پھر سے مذہبی قیادت کی طرف اٹھنے لگیں۔ اور علما یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ وہ زیادہ دنوں تک مسلمانوں کے مذہبی اور معاشرتی مفادات کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کر سکتے۔ اس لیے ایسی ہر کوشش کا، جس میں مسلمانوں کے تشخص کے ضائع ہونے کا ذرا بھی شبہ پایا جاتا ہو، انھوں نے مقابلہ کرنا شروع کیا۔ اس احساس ذمہ داری کی ایک مثال ہمیں دلّی میں منعقد ہونے والے ۱۹۷۷ء کے ملّی کنونشن میں ملتی ہے۔ اس کنونشن میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے مسلمان اپنی مذہبی اور ثقافتی وحدت کا اظہار کرنے اور اپنے حال اور مستقبل کے لیے کوئی مثبت لائحہ عمل طے کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ دوسری تجاویز کے علاوہ کنونشن نے نتھوانی کمیشن کے بارے میں بھی جو بوہرہ طبقے کے ''سیّدنا'' پر ان کے باغی متبعین کے ذریعہ لگائے گئے مبینہ الزامات کی تحقیقات کر رہا تھا، ایک تجویز پاس کر کے ان لوگوں کے خیالات کی تائید کر دی جو اس قسم کی تحقیقاتی کمیشن کی تقرری کو اقلیتوں کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کے مترادف سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو یہ بات یقیناً حیرت انگیز معلوم ہوگی کہ ایسے وقت میں جب کہ پاکستان احمدیہ فرقے کو دائرۂ اسلام سے خارج کر رہا تھا، ہندوستان کے علما بوہروں کو کلیجے سے لگا رہے تھے۔ لیکن مسلم قیادت حالات کے دباؤ کی وجہ

(☆) افسوس یہی المیہ پاکستان میں بھی دہرایا گیا، جن لوگوں نے پاکستان میں اسلامی عدل و انصاف کا خواب دیکھا تھا، وہ پورا نہ ہو سکا۔ اہل پاکستان کو سرمایہ دارانہ ذہنیت اور جاگیردارانہ قیادت سے نجات نہ مل سکی۔ (ایڈیٹر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے مجبور تھی کہ وہ چار و ناچار ''سیدنا'' کی مدافعت کرے۔ بہرحال اس سلسلے میں اختلاف رائے ہوسکتا ہے تاہم اس سے اس بات کا تو پتہ چلتا ہے کہ علما مسلمانوں کے سلسلے میں اپنے اوپر عائد شدہ ذمہ داریوں کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں۔

آج کی مسلم سیاست قطعی طور پر اس سیاست سے مختلف ہے جس کا تصور ملک کی آزادی کے فوراً بعد کیا گیا تھا۔ آج مسلمان لیڈر اور مسلم جماعتیں، خواہ وہ سیاسی ہوں یا غیر سیاسی اپنے مطالبات کا اظہار لفظوں کو چبا چبا کر نہیں کرتیں، بلکہ وہ کھلم کھلا اپنے خیال کا اظہار کرتی ہیں اور موقع آ جانے پر ملازمتوں اور پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں تعداد کے لحاظ سے مسلمانوں کی نمایندگی کا مطالبہ بھی کرتی ہیں۔ مثلاً ۱۹۸۰ء کے پارلیمانی الکشن کے موقع پر جمعیۃ العلماء ہند نے فوج، پولیس اور دفاعی محکموں میں مسلمانوں کے لیے ۳۳ فی صد جگہیں مخصوص کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اسی طرح مسلم مجلس مشاورت بھی اس بات کے حق میں تھی کہ پولیس اور انتظامی محکموں میں مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ نمایندگی ملنی چاہیے۔ امام جامع مسجد، دہلی، مولانا عبداللہ بخاری نے اپنے اس مطالبے کو پوری شدومد کے ساتھ پیش کیا تھا کہ مسلمانوں کو نہ صرف نظم و نسق قائم کرنے والے اداروں اور پولیس اور مسلح افواج میں کم از کم ۲۰ فی صد ریزرویشن ملنا چاہیے بلکہ اسی حساب سے لوک سبھا اور کابینہ میں بھی انھیں نمایندگی دی جانی چاہیے۔[۱۲] اس مقصد کے تحت اس وقت مختلف مسلم جماعتیں ایسے سیاسی گروہوں کے ساتھ انتخابی سمجھوتہ کرنے کی بات کر رہی تھیں جو ان کے مطالبات کو پورا کرنے کی ہامی بھر لیتے۔ اس انتخاب میں مختلف سیاسی پہلوانوں نے مسلمانوں کا ووٹ حاصل کرنے کی خاطر جس طرح علما کا دل جیتنے کی کوششیں کی تھیں وہ بھی ایک قابل دید منظر تھا، لیکن الکشن کے نتائج نے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی کہ مسلم عوام ہر مشکل موقع پر علما کی طرف دیکھنے اور ان کی تعظیم و تکریم کرنے کے باوجود الکشن کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی خودسر واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً اسی پارلیمانی الکشن میں سیتاپور کے حلقۂ انتخاب سے جنتا کے ٹکٹ پر، کہا جاتا ہے کہ مولانا علی میاں ندوی کی اخلاقی تائید کے ساتھ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے الکشن لڑا تھا، سہارن پور سے مولانا اسعد مدنی کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تائید سے کانگریسی امیدوار کی حیثیت سے مولانا عبدالخالق نے مقابلہ کیا تھا اور امروہہ کے حلقۂ انتخاب سے کانگریس ہی کے ٹکٹ پر مولانا عبداللہ بخاری کی حمایت کے سہارے راشد علوی الکشن لڑنے کے لیے میدان میں اُترے تھے۔ لیکن کامیاب ان میں سے کوئی بھی نہ ہو پایا۔ حالانکہ یوپی کے یہ تینوں حلقے ایک طرح سے ''مسلم حلقے'' سمجھے جاتے ہیں۔

اس تجزیہ کا مطلب یہ بالکل نہیں ہے کہ مسلم عوام پر علما کا اثر ختم ہو چکا ہے۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ الکشنی جنگ کے علاوہ ہر نازک موقعے پر عوام اپنی رہبری کے لیے علما ہی کی طرف لپکتے ہیں اور حکومت بھی اپنی مذہب لاتعلقی کا اعلان کرتے رہنے کے باوجود ایسے مواقع پر اپنے ووٹروں کی مذہبی زود حسی کو نظر انداز کر جانے کی ہمت نہیں کر پاتی۔ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے کہ سپریم کورٹ نے طلاق کے ایک مقدمہ ''شاہ بانو بنام محمد احمد'' میں یہ فیصلہ سُنایا تھا کہ طلاق دینے والے شوہر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی مطلقہ کو صرف دورانِ عدت ہی نہیں، بلکہ تاحیات یا دوسری شادی کر لینے تک نان ونفقہ دیتا رہے۔ یہ فیصلہ اگرچہ رائج قانونِ شریعت کے خلاف تھا لیکن سپریم کورٹ نے قرآن کی ایک آیت کی از خود تشریح کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اس کا فیصلہ قانونِ شریعت کے موافق ہے۔ عدالت کے اس دعوے سے علما متفق نہیں تھے۔ پہلے تو اس موضوع پر اخباری جنگ ہوتی رہی، پھر بات اتنی بڑھی کہ پارلی منٹ میں مسلم لیگ کے نمائندے جی۔ ایم۔ بنات والا نے باقاعدہ یہ تجویز پیش کی کہ پارلی منٹ عدالتی فیصلہ کو مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت قرار دیتے ہوئے کالعدم قرار دے دے۔ ابتدائی مرحلہ پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکومت جھکنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کی طرف سے اس وقت کے ایک مسلمان وزیر ریاست نے قرآن، حدیث اور فقہی اقوال کی بنیاد پر سپریم کورٹ کے فیصلہ کی بھرپور مدافعت کی۔ لیکن جلد ہی سب کو اندازہ ہو گیا کہ اگر بات قرآن وحدیث کی ہے تو پھر علما کے علی الرغم مسلم عوام کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ پسِ پردہ کیا کچھ ہوا اسے تو محرمانِ راز ہی بتا سکتے ہیں لیکن دیکھنے میں یہ آیا کہ بنات والا نے اپنا بل واپس لے لیا، اس کی جگہ خود حکومت نے ایک سرکاری بل علما کے مشورہ سے تیار کر کے پارلی منٹ کے سامنے پیش کیا جس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تائید ایک دوسرے مسلمان وزیرِ ریاست نے اسی قرآن اور حدیث اور فقہی اقوال کی بنیاد پر کی۔ بل پاس ہو گیا اور یہ قانون بن گیا کہ عدت کے بعد نان ونفقہ کی ذمہ داری طلاق دینے والے سابقہ شوہر کے بجائے عورت کے والدین اور دوسرے اعزہ پر ہوگی۔

آج مسلم سیاست کے سامنے صرف مسلم پرسنل لا کے تحفظ ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اسے اور بھی کئی ایک ہیجان انگیز مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مثلاً اجودھیا کی بابری مسجد، آثارِ قدیمہ کے تحت محصور ''صنادیدی'' مساجد میں پابندی سے نماز باجماعت ادا کرنے کا استحقاق، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ اور اب اس کے ساتھ ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسلامی اور اقلیتی کردار کی بحالی، یا اس بات کی بے معنی بحث کہ تاج محل، قطب مینار، دہلی کی جامع مسجد اور دوسری ہندی اسلامی تہذیب کی نمایندہ عمارتوں کے بانی دورِ وسطیٰ کے مسلمان بادشاہ اور سلاطین تھے یا یہ عمارتیں اصلاً مندر اور ہندو راجاؤں کے محل تھے۔ یہ فہرست طویل بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمارا مقصد یہاں ''چھیڑ خوباں'' قسم کے مسائل کی لمبی چوڑی فہرست پیش کرنا نہیں ہے۔ ہم اس بحث میں بھی نہیں پڑنا چاہتے کہ مسلم قیادت ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے مذکورہ بالا قسم کے مسائل پر جس تندہی سے لگی ہوئی ہے، وہ بہ حیثیتِ مجموعی مسلمانوں کے لیے مفید ہے یا مضر۔

یہ سوال خود اپنی جگہ بہت اہم اور جواب طلب ہے، لیکن ہمارے موضوع سے براہِ راست متعلق نہیں ہے۔ ہم نے ان مسائل کی طرف صرف اس لیے اشارہ کیا تھا کہ دیکھا جا سکے کہ آج کے ہندوستانی مسلمان کو کس نوعیت کی قیادت حاصل ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایسے تمام مسائل پر جنھیں مسلم قیادت مسلمانوں کے تشخص پر کسی طور پر بھی حملہ سمجھتی ہو، آج کا ہندوستانی مسلمان اپنے جذبات کا اظہار انفعالی انداز سے نہیں کرتا۔ وہ اپنے قائدین کے چشم و ابرو کو دیکھتا ہے اور اگر اس سے کہہ دیا جائے تو وہ اپنے اور اپنوں سب کو منزل کی تلاش میں قربان کر دیتا ہے۔ گرفتاریاں دیتا ہے، پولیس کی گولیاں کھاتا ہے، ریلیاں نکالتا ہے، مظاہرے کرتا ہے اور نہ جانے کیا کیا کچھ کرتا ہے۔ اگر پچیس تیس سال قبل کوئی اس تبدیلی کی پیشین گوئی کرتا تو لوگ اسے دیوانے کا خواب کہتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سلسلے میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ احتجاجی قیادت جدید تعلیم یافتہ سیکولر اور ماڈرن مسلمانوں کے بجائے عملاً علما کے ہاتھوں میں ہے اور جو چند غیر علما مسلم قائدین اس احتجاجی سیاست کی تماشا گاہ میں نمایاں نظر آتے ہیں، وہ بھی علما کی مدد کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔

حوالہ جات

(۱) مثال کے لیے ملاحظہ ہو، ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر کی کتاب ''دی انڈین مسلمانس'' کے ضمیمہ نمبر ۳ میں مولوی کرامت علی جون پوری کا ایک لکچر کا خلاصہ۔ (کلکتہ ۱۸۷۱ء)۔

(۲) ڈپٹی نذیر احمد، ''مسلمانوں کی حیاتِ تعلیمی''، بحوالہ رفیق زکریا، ''رائز آف مسلمس ان انڈین پالیٹکس''۔ (بمبئی ۱۹۷۰ء)، ص ۳۲۵۔

(۳) مبنی بر ''ترجمہ حالی'' مشمولہ ''مقالاتِ حالی'' مرتبہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق، (دہلی ۱۹۴۳ء)۔

(۴) سیّد محمود، ''ہندو مسلم کلچرل اکارڈ''، (بمبئی ۱۹۴۹ء)، ص ۱۶۔

(۵) بشیر احمد ڈار، ''ریلیجس تھاٹ آف سیّد احمد خاں''، (لاہور ۱۹۰۷ء)، ص ۷۶۔

(۶) اینڈ ریوز اور مکھرجی، ''دی رائز اینڈ گروتھ آف دی کانگریس ان انڈیا''، بحوالہ ڈبلیو، سی، اسمتھ، ''ماڈرن اسلام ان انڈیا''، (لندن ۱۹۴۶ء)، ص ۱۴۔

(۷) ''کانگریس انسائی کلوپیڈیا''، (انڈین نیشنل کانگریس ۱۸۸۵ء-۱۹۳۰ء)، مرتبہ: کے، ایشوردت، (دہلی، نیا ایڈیشن)، ص ۲۷۰۔

(۸) ایضاً، ص ۳۴۹۔

(۹) مثال کے لیے ملاحظہ ہو، مولانا محمد میاں ''جمعیۃ کیا ہے؟''، جلد۲، (دہلی ۱۹۴۶ء)، ص ۱۵۔ علاوہ ازیں، ابوالکلام آزاد ''خطباتِ آزاد''، (دہلی ۱۹۵۹ء)، ص ۵۵، ''الہلال''، جلد۱، شمارہ ۳ (۲۷/ جولائی ۱۹۱۲ء) نیز مولانا عبدالماجد بدایونی، ''درسِ خلافت'' (پہلی اشاعت ۱۹۲۰ء)، پانچویں اشاعت میرٹھ، ب، ت، ص ۴۴، مولانا محمود حسن ''ترکِ موالات'' (بجنور ۱۹۱۹ء)، ص ۳۶۔

(۱۰) مولانا شبیر احمد عثمانی، ''پیغام بنام موتمر کل ہند جمعیۃ العلماء اسلام'' (لاہور ۱۹۴۵ء) ص ۴۳۔

(۱۱) مولانا ابوالحسن علی ندوی ''خطبۂ صدارت'' دینی تعلیمی کونسل، مرادآباد اجلاس ۱۴/ جون ۱۹۶۹ء۔

(۱۲) ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی، ۲۸/ ستمبر ۱۹۷۹ء، ص ۳۔

© rasailojaraid.com